ناہید ناز
پی ایچ- ڈی سکالر (اُردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر سلیم اختر کا نفسیاتی مطالعہ

Dr. Saleem Akhtar (B:1934) is known as distinguish critic, fiction writer and psychologist from almost seventy years of his creative life. He wrote almost hundred books including Urdu literature, criticism, history of Urdu language and literature, psychology and satire. He wrote his auto-biography named: 'Nishan-e-Jigar-e- Sokhta' in 2005, which is in fact psycho-analysis of his personality. This article is an attempt to peep into psychological effects in Dr. Saleem Akhtar's personality with the help of his auto biography 'Nishan-e-Jigar-e- Sokhta'.

کہا جاتا ہے کہ چہرہ ، جذبات واحساسات کا آئینہ ہوتا ہے جس میں انسان صدرنگ نقوش کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے چہرے پر یہ مقولہ صادق نہیں آتا کیونکہ سپاٹ اور بے تاثر چہرے ، شانت اور پرسکون جسم، گم سم اور جذبات سے تہی ڈاکٹر سلیم اختر بظاہر برف کی سِل کی مانند یخ بستہ نظر آتے ہیں لیکن یہی ڈاکٹر سلیم اختر جب قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی نوک سے کیسی کیسی تلاطم خیز موجیں اور اُبلتے آتش فشاں پھٹنے کو آمادہ ملتے ہیں ۔ ان کے شانت چہرے کے پس پشت جذبات واحساسات کی برانگیختگی کا بھرپور اظہار ان کی تخلیقات میں ملتا ہے ۔ افسانہ، نقد، تحقیق، نفسیات ، جائزے، تبصرے اور خودنوشت میں ہمارا سامنا جس ڈاکٹر سلیم اختر سے ہوتا ہے وہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق ڈاکٹر سلیم اختر کے متضاد ہیں۔ انہیں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں راہ حیات کے سرسٹھویں موڑ سے مڑکر پیچھے دیکھتا ہوں تو سرو چراغاں کی جگہ جل بجھی شمعوں کا دھواں، گل وگلزار کے برعکس رقص وحشت میں محو بگولے، جذباتی نشیب وفراز اور ریگ رواں کی ہم سفری ، لیکن خارج کے برعکس یہ باطنی کیفیات ہیں کہ میں نے درحقیقت باطن ہی میں زیست کی ہے ۔ چہرہ شانت مگر من اشانت ۔ (۱)

انہوں نے اپنے اندر کی اعصابیت، عصبانیت ،نیوراتیت ،تشویش ، اضطراب ، نرگسیت ، خوف، عدم تحفظ ، داخلی کش مکش، خارجی عدم مطابقت جیسے متلاطم جذبات و ہیجانات کو خارجی نقاب(Persona) کے ذریعے کمال مہارت سے چھپائے رکھا۔ دنیا کے سامنے بے تاثر اور پرسکون چہرے کا نقاب پہنا جبکہ اندروں میں جذباتی دھاچوکڑی مچی رہی ۔ڈاکٹر سلیم اختر نے خودنوشت (نشان جگرسوختہ) میں اپنی تحلیل نفسی کر کے حتی المقدور یہ نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کسی حدتک کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ ان کی شخصیت کے جومظاہر ،فن ونقد میں علامتی پیرائے میں ملتے ہیں ،

خودنوشت میں اعلانیہ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔نفسیات سے طبعی میلان اور شغف کی بناپر'خودشناسی' ، عورت ، جنس اور جذبات ، 'مرد' جنس اورجذبا ت ، 'ہماری جنسی اور جذباتی زندگی ' 'تین بڑے نفسیات دان ' نفسیاتی دبستانِ تنقید ، لکھنے والے اور'مغرب میں نفسیاتی تنقید ' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ قلم بندکرنے والے ڈاکٹر سلیم اختر جب میرؔ، غالبؔ ، اقبالؔ ، جوشؔ ، اور مجیدامجد کے نفسیاتی مطالعات قلم بندکرتے ہیں تو دراصل وہ اپنی ذات اور شخصیت کا عدسہ استعمال کرتے ہیں ۔ ان شخصیات کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے ان پہلوؤں کو بالخصوص زیرِنظر رکھا جو بذاتِ خود ان کی شخصیت کے لیے جاذب نظر تھے۔

خودنوشت نشانِ جگرسوختہ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیات دان ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔انہوں نے اپنی تحلیل نفسی کرکے اپنا ''اندرون'' باہرنکالنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے اگرچہ انہیں داخلی مزاحمتوں کی بنا پر اس امر کی انجام دہی میں مشکلات کا شعور تھا۔ بہت سے واقعات، مشاہدات اور تجربات پھر بھی تشنہ تحریر رہے ۔ انہوں نے خود کو مکمل ایکسپور نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

> نشانِ جگرسوختہ پر تین برس سے زائد صرف ہوئے، وجہ طوالت کے برعکس میں خود تھا۔ اپنی تحلیل نفسی ، نامکمل نہ سہی، مگر آسان بھی نہیں کہ اس میں دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔۔۔کہاں سے شروع کروں، کیا کیا سامنے لاؤں اور پردہ پوشی کتنی؟ واقعات کی بیلنس شیٹ مدون کرنی آسان نہ تھی ۔۔۔ذات کی گہرائیوں میں کس طرح اترا جائے اور وجود کے پیچ وخم کو کیسے سمجھا جائے؟ الجھنیں ہی الجھنیں، لکھا، کاٹا، پھرلکھا، پھرکاٹا۔ اسی طرح کوئی پچیس تیس صفحات سیاہ ہوگئے ۔۔(۲)

نشان جگرسوختہ میں ڈاکٹر سلیم اختر خودعامل بھی ہیں اور معمول بھی، خوداپنے نفسی معالج بھی ہیں اور مریض بھی۔ ان کے یہاں ماہر نفسیات کی سی تکنیکی مہارت اور سائنسی اپروچ نظر آتی ہے۔ ان کی خودنوشت میں موجود مواد کی مدد سے ڈاکٹر سلیم اختر کے نہاں خانوں میں جھانکنا مشکل نہیں۔ جہاں تک 'شخصیت' کا تعلق ہے تو اس لفظ کا تو ماخذ ہی یونانی لفظ 'Persona' ہے جس کا مطلب ہے 'نقاب' ۔ انسان فی الواقعی خود کو نقاب میں ہی رکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ تمام کجیوں ، ناراستیوں ، ٹیڑھے پن، خامیوں، محرومیوں، ناآسودگیوں اور داخلی شکست وریخت سمیت۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے عمداً یہ نقاب الٹنے کی کوشش کی ہے۔'نشانِ جگر سوختہ ' میں متضاد رویوں اور رجحانات کا حامل ڈاکٹر سلیم اختر سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ ان کے اعترافات آج کے منافقت بھرے اور دوغلے دور میں جرأت مندانہ، دیانت دارانہ اور بے باکانہ طرزِعمل ہے۔

خودنوشت میں وہ کہیں خود سے اور کہیں معاشرے سے برسرپیکار ملتے ہیں ۔عصبانیت، نیوراتیت ، اضطراب ، تناؤ، مردم بیزاری، خلوت پسندی ، نرگسیت ، مختلف طرح کے خوف، جنس سے لگاؤ، حسن پرستی جیسے رجحانات کی موجودگی ، ان کی شخصیت میں پیچیدگی ، الجھاؤ اور عدم تفہیم کے غماز ہیں۔

ماہرینِ نفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ونشوونما میں ورثہ اور ماحول کلیدی عناصر ہیں۔ انسانی

کردار وعمل ، اخلاقیات، اعتقادات ، رجحانات ومیلانات اور افکارو تخیل ان اساسی عناصر کے زیراثر بنتے اور پنپتے ہیں ۔ اس نظریے کے تحت اگر ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ہاں ورثہ اور ماحول دونوں میں بظاہر کوئی ایسی ناآسودگی ، جذباتی الجھن، وراثتی انبارملٹی نظرنہیں آتی جوان کی شخصیت میں عصبانیت ، نیوراتیت ، اضطراب کی وجہ بنے۔ مرفّہ الحال، آسودہ وخوشحال ، اعلیٰ تعلیم یافتہ ، آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سے منسلک ددھیال ، زمیندار ، ٹھاٹ باٹ والاننھیال ۔ ماں ''امام بی بی'' راجپوت نسل کے حسن کا شاہکار۔ حسنِ مزاح، دانش وفہم اور سلیقہ شعاری سے لبریز خاتون تھیں۔شفیق باپ، بہن بھائیوں کا باہمی پیارکا ماحول۔سکون بھرا گھر، گفتار وعمل کی آزادی۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ نظرنہیں آتی جیسے ہمارے ہاں کے تخلیق کاروں کے بچپن کی عدم آسودگیاں، بالخصوص والدین میں سے کسی ایک سے شدید نفرت یا ان کی طرف سے بے اعتنائی اورعدم توجہی کے رویے ملتے ہیں (جیسے میؔر کے ہاں بچپن کی یتیمی)، (انیس ناگی کے ہاں باپ سے بیزاری) ، (غالبؔ کے ہاں خاندانی تفاخر کا رجحان) ۔ ڈاکٹرسلیم اختر طمانیت اور پرسکون زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اباجی کے رویے کو اگر ایک نقطہ میں بیان کرتا ہوں تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اولاد کے بجائے انسان سمجھتے ہوئے ہمیں وہ شخصی آزادی دی جو چوتھی دہائی میں بالعموم کم یاب تھی۔ اسی لیے مجھے چھپ کر کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔۔۔۔اباجی، آپاجی اور ہم سب بچے مل کر گپ شپ لگاتے اور دوستانہ قہقہوں سے فضا گونجتی رہتی ۔۔۔(۳)

جہاں تک معاشرتی ماحول کا تعلق ہے، ڈاکٹرسلیم اختر (پ ۱۱مارچ ۱۹۳۴ء) لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد(عبدالحمید) ملٹری اکاؤنٹس میں تھے اور بسلسلۂ ملازمت ، پونا، انبالہ ، امرتسر ، لاہور اور دیگر مختلف شہروں میں رہے ۔ یوں ڈاکٹرسلیم اختر کا بچپن مختلف شہروں میں بکھرا ہوا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑی اور ۱۹۴۰ء میں ان کے والد کو مڈل ایسٹ بھیج دیا گیا تو سلیم اختر مع اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے، فورٹ سنڈیمن (کوئٹہ) اپنی پھوپھی (رشیدہ) کے ہاں رہے۔ یہاں کے اثرات ڈاکٹرسلیم اختر نے اپنے اندر جذب کیے۔ یہاں کا صحرائی علاقہ، گرم ریت، سیاہ بچھو اور کڑوی کونین کا شربت (جب انہیں ملیر یا ہوا تھا)، ان کے بچپن کی شعوری یادیں ہیں۔'پونا' کی اپنی تہذیب تھی (جہاں ڈاکٹرسلیم اختر ۱۹۴۲ء میں اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ چھاؤنی میں رہے) آزاد ماحول ، رین بوٹا کی، سینما ، ہندو مسلم ، عیسائی ،سکھ خاندانوں کا باہمی میل جول ، پونا کا اساطیری روپ ، جادوٹونے ، بھوت پریت پر اعتماد، آٹھ سالہ سلیم اختر کی شخصیت کی نمو میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ یہ اثرات ان کی شخصیت میں اس حد تک راسخ ہوئے جو بعد میں ان کی آزادروی، انسان دوستی ، بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری کے لیے محرک ثابت ہوئے۔ اساطیری رجحانات کی طرف ان کا میلان بھی ''پونا'' کا زرخیر کلچر تھا جو کو ڈاکٹرسلیم اختر ''Exotic پونا کہتے ہیں''۔(۴)

پونا میں مسلم انجمن کے پرائمری سکول میں دوسری جماعت میں داخلہ بھی عجب منفی کنڈیشننگ کا باعث بنا جب وہ نیکر اور قمیض پہن کر، بالوں کی مانگ نکال کر سکول گئے تو ماسٹر صاحب سے سخت ڈانٹ پڑی ، اسے 'کرسٹان' (کافر) کہا گیا اور پاجامہ اور سر پر ٹوپی پہننے کی سختی سے تاکید کی گئی۔ استاد کے سخت لہجے اور ٹوپی سے منفی کنڈیشننگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

۔۔۔گھر آ کر خوب رویا کیونکہ ماسٹر نے کہا تھا کہ آج تو پہلا دن ہے ،کل ٹوپی کے بغیر آئے تو سکول سے نکال دیئے جاؤ گے۔ اس دن مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مسلمان ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ۔۔۔ ٹوپی تو خرید لی مگر ہوا یہ کہ جب بس پرسوار ہونے لگے تو کسی نے پاکٹ مارلی، یہ مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں سو مہینہ بھر کی تنخواہ میں ٹوپی پڑی۔ یوں ٹوپی سے میری ایسی نیگیٹو کنڈیشننگ ہوئی کہ ہنوز ہر رنگ، قطع اور نسل کی ٹوپی ناپسند ہے۔(۵)

استاد کے سخت رویے اور ٹوپی سے منفی کنڈیشننگ بعد میں ان کی شخصیت میں مذہبی انتہاء پسندی ، متشدد اور کٹڑ مذہبیت کے خلاف بغاوت اور انحراف کی صورت میں سامنے آیا جوان کے افسانوی ادب (وہ افسانے جن میں مولوی کے اندرون کی خباثت دکھائی گئی ہے جیسے'خبیث داپتر' جیسا افسانہ) اور بنیاد پرستی جیسی تخلیق میں نظر آتا ہے۔

پونا میں محیّر العقول اور مافوق الفطرت عناصر سے وابستہ اساطیری روایات، کردار، واقعات نے ان کی شخصیت میں خوف کی فضا کو جنم دیا جبکہ آزاد جنسی بحث ومباحث اور مجمہ بازوں کے ذوجنسی حرکات نے جنس میں دلچسپی کی راہ دکھائی ۔ اس وقت ان کا مشاہدہ ایک معصوم بچے کا تھا لیکن ذہن کے کیمرے میں ان واقعات کو اپنے تحت الشعور میں جمع ومدون کرتے رہے جنھوں نے بعد میں ان کی شخصیت اور تخلیقات میں بار پایا۔ بطور نفسیات دان انہیں اس کا ادراک ہے :

۔۔۔ابتدائی زندگی کے ان واقعات نے مجھ پر خاصے گہرے اثرات چھوڑے ہوں گے، بچپن کے ان واقعات کے اعصابی اثرات، تحت الشعور میں جاگزیں رہے اور جب لکھنے کا آغاز ہوا تو انہوں نے تخلیقی محرک کی صورت اختیار کرلی، اسی طرح ان واقعات سے مشروط خوف بھی میری شخصیت پر اثرانداز ہوتا رہا ہے، میرے متعدد افسانوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ، اسی خوف نے افسانوی دنیا کی تشکیل کی ہے۔ ۔۔۔اگر میں نے شیطان کی پوجا کے موضوع پر افسانہ ''اماوس'' قلم بند کیا تو یہ بات باعث تعجب نہ ہونا چاہیے ۔میری ابتدائی کنڈیشننگ کا یہی تقاضا تھا۔ (۶)

خوف ، ان کی شخصیت کا غالب رجحان ہے جس نے عدم تحفظ اور خوداعتمادی میں کمی جیسے رویوں کو ان کی شخصیت کا حصہ بنایا۔ بظاہر خوداعتماد، بے باک اور نڈر سلیم اختر کے باطن میں ایک سہا ہوا، خوف زدہ ، گردوپیش کے ماحول سے عدم تحفظ کا شکار بچہ چھپا ہوا ہے۔ یہ خوف اس کے اندر کے تلاطم خیز رویوں کے ہمراہ بپھر جانے کا بھی ہے، معاشرے میں موجود منافق، متشدد، تخریبی رجحانات کے غالب آجانے کا بھی ہے۔ جو سلیم اختر کو ہجوم میں تنہا ،مجلس میں بے زارا ور گفتگو میں کنجوس بنا دیتا ہے۔ اپنے من میں موجزن خوف کا انخلاء انہوں نے ارتفاعی صورت میں تخلیقات میں کیا۔ ان کے افسانے 'تیرھواں برج' ، 'جنوں کی رات' ،'نادیدہ' ، 'شکتی' ،لہو کی چھچھاہٹ' ،'سب کہاں ؟' ان کے شخصی خوف کے نفسیاتی مظاہر ہیں جن کے ڈانڈے بچپن کے تحیر خیز واقعات سے جڑے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

کچھ خوف میری شخصیت کا لازمی حصہ ہیں۔جن سے میں چاہوں بھی تو خلاصی نہیں پا سکتا۔ یہ خوف لاشعوری طور پر میری تحریر میں آئے ہیں اور افسانوں میں اظہار پا گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے بلند جگہوں سے

خوف آتا ہے، نادیدہ قوتوں کا خوف اپنے حصار میں لیے رکھتا ہے۔ جو مجھے اندر سے بے کل کیے دیتا ہے، موت کا خوف مجھے پریشان رکھتا ہے۔ دم نکلنے کا خوف نہیں، موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ دیگر تلازمے کفن، قبر، لوگوں کا ہجوم، آہ بکا حتیٰ کہ کافور کی مشک، جسے میں اس وقت بھی قوت شامہ سے محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔۔(۷)

یہ تو خوف کی وہ انواع ہیں جن کا شعوری اظہار ڈاکٹر سلیم اختر کر گئے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے نہاں خانوں میں جھانکا جائے تو ان کی مردم بیزاری، تنہائی پسندی اور ہجوم میں سے کترا کر نکل جانے کے پس پشت بھی معاشرتی کج رویوں اور منہ زور منافقتوں کا سامنا ہوجانے کا خوف ہے۔ اس لیے انہوں نے خود کو سب سے الگ تھلگ اور دور رکھا تا کہ معاشرتی ناراستیوں اور مفاہمی رویوں سے ٹکر نہ ہوجائے۔ جب وہ جھوٹ اور فریب کی حمایت نہیں کر پاتے تو تنہائی میں فرار حاصل کر لیتے ہیں اور تخلیقی عمل کے ذریعے قلم کا وار کرتے چلے جاتے ہیں۔ 'بچھو سے ملاقات'، 'سب کہاں؟' 'بچھو' جیسے افسانے ان مکروہ اور شر پسند عناصر کے مقابلے میں معاشرتی عدم تحفظ، افراد معاشرہ کی بے بسی، بے کسی اور ان دیکھے خطرات کے غلبے کے خوف کا اظہار ہیں۔ عدم تحفظ، تنہائی او ربعض اوقات انسان کی وحشتوں کا خوف، نادیدہ قوتوں کے غالب آجانے کا خوف، الغرض خوف کا عنصر کسی نہ کسی صورت میں ان کے اندر موجود ہے۔ جنس سے انتہائی دلچسپی کے باوجود 'عورت' کے وجود سے کترانا اور کن اکھیوں سے اس کے حسن کا نظارہ کرنا، اس کی آواز کی شیرینی سے من ہی من میں لطف اندوز ہونا بھی داخلی خوف کے ہی مرہونِ منت ہے جو معاشرتی تحریمات اور مذہبی ضوابط میں گھرے سلیم اختر کو 'کاسانووا' بننے کے عمل سے روکتا ہے اور 'معصوم' شرمیلا اور بیبا، سلیم اختر بنائے رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت میں جنس سے دل چسپی کا غالب رجحان ملتا ہے۔ پونا میں رہائش کے دوران مجمع بازی، کھلے عام جنسی اور ذو معنی گفتگو ''Peeping tom'' کچھ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے نیم برہنگی کے مناظر، ان کے حافظے میں نقش ہوگئے۔ یہ واقعات فرائڈ کے نظریہ جنس کے مطابق ان کے لاشعور میں رہے اور کھلم کھلا اظہار نہ ہو پانے کی وجہ سے ترفع (Sublime) پا کر تخلیقی عمل میں ڈھل گئے۔ مٹھی بھر سانپ اور کڑوے بادام کے افسانے ان کے جنسی رجحان کے تخلیقی ارتقائی عمل کی مثالیں ہیں۔ جہاں کم گو، شرمیلے اور زن بیزار سلیم اختر دل کے پھپھولے پھوڑتے نظر آتے ہیں۔ بچپن ہی سے جنس اور اس کے متعلقات کا شعور، بعض حسیات کی وقت سے پہلے بیداری اور ان کی عدم تشفی ردعمل کے طور پر عصبانیت، اعصابی دباؤ اور ذہنی بے کلی کا باعث بنی۔ خود ان کے زبانی سنیے:

اوائل شباب ہی سے میں اعصابیت کا شکار رہا ہوں۔ نفسیات سے دلچسپی کا آغاز بھی اسی وجہ سے ہوا تھا کہ خود کو سمجھنے کے لیے تحلیل نفسی اور انبارمل سائیکالوجی سے مدد لی اور بڑی حد تک میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔۔۔اگرچہ میں نے عمر بھر نارمل بلکہ ضرورت سے زیادہ نارمل رہ کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اعصابی سطح پر میں نے اس کی کتنی بھاری قیمت ادا کی ہے اسے کوئی نہیں جان سکتا۔ جنسی امتناع و تشنگی میرے اعصابی اور فکری نظام پر ہمیشہ سے اثر انداز رہی ہے، بالخصوص میری ابتدائی دور کی کہانیاں اور افسانے اسی

کے پیدا کردہ اعصابی تناؤ کے کیکٹس ہیں۔ (۸)

یوں بھی وہ معاشرتی امتناعات ،تحریمات اور بے جا اخلاقی قیود وضوابط کے خلاف ہیں۔ اگرچہ قاعدہ قانون اور منضبط طرز زیست کو باشعور معاشرے کی تشکیل میں کلیدی عناصر قرار دیتے ہیں لیکن ازحد انضباطی رویوں کے خلاف ردعمل ان کی شخصیت کا خاصا ہے جس کا تخلیقی اظہار ان کے فن میں ملتا ہے۔ ان کے مطابق:

> انسانی فطرت کا یہ خاص وصف ہے کہ ع'' پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے'' کے مصداق جنس اوراس کے صحت مندانہ اظہار پر پابندیاں بالواسطہ اظہار یا تسکین کے ذرائع کبھی مسدود نہ کرسکیں ۔فرانس ، اٹلی، سپین وغیرہ کے مقابلے میں انگلستان میں تحریمات وغیرہ کی بناپر بظاہر تو جنسی شرم کا راج تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ گلی کوچے طوائفوں سے اٹے پڑے تھے۔ (۹)

سوچا جائے تو تخلیق کے نفسیاتی محرک کے طور پر ان کی شخصیت میں جنس کا یہ غلبہ ترفع پاکر افسانوی واقعات اور کرداروں میں ڈھل گیا ۔ سوچیے ! اگر وہ تخلیق کار نہ ہوتے تو جنس کا یہ سیلاب انہیں بہاکے کہاں لے جاتا۔ وہ اچھے خاصے'' کاسانووا'' بن جاتے۔ معصوم اورشرمیلے سلیم اختر نہ رہتے ۔جنس سے برملا دلچسپی اور امتناعات اورتحریمات بھرے معاشرے میں سے تنے ہوئے اعصاب کوسکون دینے کے لیے فن کا راستہ چنا۔ معاشرتی خوف اور ناپسندیدگی سے بچنے کے لیے علامتی روپ دھارے جبکہ جنسی واقعات پرنارمل اور ابنارمل کرداروں کی تخلیق سے Vicarious Pleasure بھی حاصل کرلیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت میں کارل گستاؤ ژونگ کے نظریہ شخصیت کے اہم عنصر تصویر زن (Anima) اور تصویر مرد (Animus) کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ژونگ کے اس نظریے کے مطابق:

> مرد کے لاشعور میں ایک نسائی پیکر ہوتا ہے جس کا اس کی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہرعورت کے لاشعور میں ایک مردانہ پیکر ہوتا ہے ۔۔۔مرد کی شعوری زندگی ان کے حوالے سے متشکل ہوتی ہے اور وہ معاشرے میں اپنی جگہ بنانے کے لیے سرگرم ہوتا ہے۔ اس کاروائی میں وہ اپنے نفس کے نسائی پہلوؤں کو دباتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں عورت کی تمثال ابھرکراس کی زندگی پراثرانداز ہوتی ہے۔ ۔۔۔زندگی کے نسائی پہلو میں جذباتی وجدان اور غیرعقلی عناصر کارفرما ہوتے ہیں مگر مردانہ شعور ان سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ اگران عناصر اورشخصیت کے ان مطالبات سے آنکھیں چرائی جائیں تو یہ مکمل طور پر لاشعور کی گرفت میں چلے جاتے ہیں۔۔۔ لاشعور کے نسائی اصول کواگر قبول کرلیا جائے تو وہ مردانہ شعور کومکمل کرتا ہے۔ (۱۰)

ڈاکٹر سلیم اختر کے نین نقش ، پتلے تراشیدہ ہونٹ، گولائی کی جانب مائل خوبصورت گلابی چہرہ، شرارتی آنکھیں ، دھیمہ لب ولہجہ جوکبھی شوخ ہوجاتا ہے، نسوانی حسن وادا کا پیکر ہے۔شفقت آمیزی اور حسِ مزاح انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا۔ ان کی شخصیت میں شرمیلا اور چلبلا پن ، زودرنجی ، خودپسندی، عدم تحفظ کا احساس جیسے رویے ان کا نسوانی

رنگ ابھارتے ہیں۔ اور یہی رجحانات انہیں عورتوں کے زیادہ ہمدرد، قریب اور رازداں بنادیتے ہیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ:

> اکثر عورتیں اپنے گھریلو مسائل یا ذاتی مشکلات کا اظہار مجھ سے پورے اعتماد سے کرتی ہیں۔ نہ جانے انہیں میرے اوپر اتنا اعتماد کیوں اور کیسے آجاتا ہے۔ حالانکہ پدرسری معاشرے میں، جہاں عورتیں کسی نہ کسی مرد کی ڈسی ہوئی ہیں، میں بھی تو ایک مرد ہی ہوں۔ لیکن راہ چلتی انجان عورت یا سفر کے دوران ملنے والی عورت بھی اگر دل گرفتہ ہے تو وہ مجھ سے اپنے مسائل کا تذکرہ بلا جھجک چھیڑ دیتی ہے۔ (۱۱)

'چالیس منٹ کی عورت' اور 'کاٹھ کی عورت' نامی افسانے ڈاکٹر سلیم اختر کو سفر کے دوران ملنے والی عورتوں کی دکھ بھری کتھائیں ہیں جن میں سے اول الذکر انہیں دہلی سے لاہور ریل کے سفر کے دوران ملی جبکہ ثانی الذکر لاہور سے ساہیوال کے درمیان ریل کے سفر کے دوران ان کی ہم سفر تھی جس نے خاوند کے ظلم وتشدد کی کتھا افسانہ نگار کو سنائی۔ افسانہ 'جنم روپ' میں نارسس (نرگس) کا سمندر میں ڈوب کر نسائی روح (Anima) میں ضم ہوجانا، وحدتِ مردوزن کی تکمیل کا ثبوت ہے۔ کیونکہ پانی میں نارسس کا عکس اسے اپنی آنجہانی بہن کا عکس معلوم ہوا جس کے بغیر وہ اپنے وجود کو نامکمل سمجھتا تھا۔ اس تخلیق کے پس پشت لاشعوری محرکات کا جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر کی اپنی شخصیت کا نسائی رخ، جو عدم تکمیل کی بنا پر 'وحدت' کا تمنائی ہے، نوجوانی میں دیکھے گئے اس خواب کا تمثیلی پیکر ہے:

> میں نے ایک خواب دیکھا۔ ایسا خواب جو بار بار نہیں دیکھا جاتا، ایسا خواب ہنوز ذہن میں جس کا تاثر محفوظ ہے۔ ایک پیکر جمال، بے حجاب، بے لباس، نسوانی حسن کا ارفع نمونہ، حور پری کی مثال، جسم سے حسن کی شعاعیں یوں خارج ہورہی ہیں کہ تارِ نگاہ کا جسم پر ٹھہرنا محال۔ نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا، میں نے اسے صرف دیکھا، چھوا نہیں ۔۔۔۔نوجوانی کی نادانی میں، اس خواب کی جنسی مفہوم میں سمجھا، لیکن جب خاصہ عرصہ بعد میں نے ژونگ کی نفسیات کا مطالعہ کیا تب جانا کہ وہ محض عورت نہ تھی بلکہ مرد میں ملنے والی نسوانی روح (Anima) کا عکس جمیل، نصف زندگی کی قیمت پر اسے حاصل کرنے کی دعا دراصل شخصیت کی تکمیل کی آرزو تھی۔ (۱۲)

ڈاکٹر سلیم اختر کے من میں عورت سے قرب کے حصول کی خواہش ہمیشہ موجزن رہی ہے۔ بظاہر 'زن گریز' رویہ بباطن عورت کے وجود کے انتہائی قرب کا تمنائی رہا، عورت کی میٹھی سریلی آواز انہیں بے حد پسند ہے۔ وہ عورت کے پیکر حسن کے بھی شیدائی ہیں۔ ان کے فن میں عورت کے حسن کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ تلذّذ یا فحاشی کے لیے نہیں۔ بلکہ یونانی فلسفہ جمال کے عین مطابق حسن پرستی اور والہانہ وارفتگی کا اظہار ہے۔ وہ عورت کی دلبری اور دلربائی کے شائق ہیں۔ رنگ وبو خوش ادائی اور رعنائی جیسے یونان کی دیویاں ہوں۔ ایسا ہی خیالی نسوانی پیکر ان کی شخصیت کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ان کے لاشعور کا تخلیقی اظہار ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں عورت کا خوب صورت پیکر تراشتے ہیں، خدوخال کی رعنائیوں کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں وہ کسی پختہ کار مصور کے کینوسی پیکر یا مجسمہ ساز کے تراشیدہ معجزۂ فن سے

کم نہیں۔

یہ ڈاکٹر سلیم اختر کے تکمیل ذات کے نظریے کا وہ جمالیاتی رخ ہے جس نے نسائی سمت میں نمو پائی ہے ۔ وہ اپنے فن میں ایتینیھز (یونان) کی حسینہ فرائی نی (افروڈائٹی آف ایلپس) ، مارلین منیرو، صوفیہ لورین، برجی باردت کے جسمانی پیمائش تک کا تذکرہ یونہی تو نہیں کر لیتے بلکہ ان کے تخیلاتی روپ ، ان کے دل میں نقش ہیں جس کی پوجا من ہی من میں کرتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کا غالب رجحان ان کی جمال پسندی ہے ،حسن خواہ پھول میں ہو، عورت میں یا کسی منظر میں ، ان کا دل موہ لیتا ہے۔ خوب صورت چہرے، خوش نما خدوخال ،میٹھی اور مترنم آوازیں انہی لبھاتی ہیں۔ نسوانی حسن کا نصف حصہ اس کی آواز کو قرار دیتے ہیں لیکن عورت کی آنکھوں میں جھانک نہیں سکتے۔ قوتِ سامعہ سے لذت افروز رہنے اور شرمیلی دوشیزہ کی طرح آنکھیں جھکائے رکھنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں ۔ موسیقی کے تال وسُر اور مدھر خوش آواز سے ان کے جذبات کی برانگیختگی پر افلاطون کا نظریہ صادق آتا ہے ۔انہیں خود بھی اس حقیقت کا ادراک ہے، لکھتے ہیں:

> میں نے شعوری طور پر اپنی ایسی تربیت کی ہے کہ میں جلدی جذباتی نہیں ہوتا لیکن موسیقی میری اتنی بڑی کمزوری ہے کہ اچھی آواز اور خوب صورت دھن کو میں آنسوؤں کی صورت میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ تال کے زیر و بم کے ساتھ میری نبض ہم آہنگ رہتی ہے تو فشارِ خون آواز کے مدوجزر کا مظہر ہوتا ہے۔
>
> میرے لیے عورت کا آدھا حسن صرف اس کی آواز میں ہے۔ یورپین کی طرح مجھے بھی عورت کی Husky آواز سامع نواز محسوس ہوتی ہے۔ کرخت یا چیں چیں کرتی آواز اعصاب پر ناگوار اثرات ڈالتی ہے۔ جنسی کشش کی حامل آواز والی عورت کی محض آواز کی خاطر گھنٹوں اسی کی بے تکی باتیں سن سکتا ہوں جبکہ بری آواز میں دانش کے موتی بھی نہ بھائیں۔ (۱۳)

ڈاکٹر سلیم اختر اساطیری روایات،علم الاعداد ، برجوں اور زائچوں پر یقین رکھتے ہیں ۔خود نوشت میں ''برج حوت'' (ڈاکٹر سلیم اختر کا برج) کی علامت، اس کے بنیادی عنصر (پانی) ، حاکم سیارہ (نیپچون) ،خوش بخت عدد(5) اور (8) ، اسی برج کے زیر اثر افراد (تاریخ پیدائش ۲۰ فروری تا۲۰ مارچ) کی خصوصیت میں وجدان کے حامل ،خواب دیکھنے والے شاعر، ادیب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے تخلیقی فنکار،مخفی علوم سے واقفیت ، بے حد حساس شخصیت کے مالک جیسی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ متنوع اور متضاد رجحانات کے حامل افراد ہوتے ہیں۔ (۱۴)

گویا ان کا اعتماد برجوں،علم الاعداد پر قوی ہے۔ جبھی تو انہوں نے اپنا زائچہ (عمر زمان سے) بھی لکھوایا تھا۔

اساطیری رجحانات، پیراسائیکالوجی ، انتھروپولوجی اور مافوق الفطرت عناصر میں دل چسپی کے ڈانڈے ان کے بچپن کے ان قصے کہانیوں سے ملتے ہیں جو ان کی آپا جی (والدہ) دل چسپ اور تحیر خیز اسلوب میں انہیں سنایا کرتی تھیں۔ جن میں سے بیش تر سچے واقعات تھے جو ان کی والدہ کے ساتھ پیش آئے تھے ۔ ان واقعات میں راتوں کو جنوں کے بچوں کا ان کے ساتھ کھیلنا، ان کے گھروں میں چھل پائیوں ، چھلاؤوں اور جن بھوت کا آباد ہونا، زبان دراز اور بدکردار عورت

کی قبر سے شعلوں کا نکلنا اور بلند آہنگ چیخوں کا سنائی دیناوغیرہ۔ بچپن میں سنے جانے والے یہ قصے ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کے تہہ خانے میں چھپے رہے جنھوں نے ان کی شخصیت اور تخلیق دونوں کو متاثر کیا۔ لکھتے ہیں:

میں زندگی میں فلسفہ، منطق، عقل اور سائنس کا بہت زیادہ قائل ہوں لیکن اب بھی ذہن کا ایک گوشہ ان غیر عقلی اور غیر منطقی واقعات سے وابستہ تحیر کا اسیر ہے شاید اس لیے کہ میں نے اندر کے اس بچے کو جذباتی لحاظ سے پال پوس کر تروتازہ رکھنے کے لیے اسے پروفیسر نقاد کے سائے سے بچائے رکھا۔ میں نے چھل پائیوں، آسیب، روحوں، ویمپائر، کالے جادو یا مافوق الفطرت سے وابستہ خوف پر بعض افسانے لکھے جو جدید افسانوی رجحان سے لگا نہیں کھاتے تو اس کا باعث یہی ہوسکتا ہے کہ میرا تحت الشعور بچپن کے ان واقعات کے سحر سے آزاد نہ ہوسکا۔ (۱۵)

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت میں خود پسندی، الفت ذات اور نرگسیت کے رجحانات بھی ملتے ہیں۔ اس زمانے کے گریجویٹ دادا (قاضی عبدالحکیم قریشی) افغان شہزادوں کے اتالیق، معزز اور باوقار شخصیت، ملٹری اکاؤنٹس بلوچستان میں پولیٹیکل ایجنٹ والد بھی ملٹری اکاؤنٹس میں تعینات، والدہ راجپوت خاندان کی حسین عورت، نانا، راجپوتوں کے مثالی حسن کے نمونے، چھ فٹ سے نکلتا قد، اکڑی گردن، ستواں اونچی ناک، باریک نقوش اور پاٹ دار آواز، الغرض نجیب الطرفین، سلیم اختر نرگسیت اور خاندانی تفاخر کے حامل رجحانات کے مالک کیوں نہ ہوں؟ لکھتے ہیں:

پھر گھر میں پہلا لاڈلا بچہ تھا۔ گھر پر میرا راج تھا۔ اس حد تک کہ خالد اور عابد دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور میں ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ بعض دفعہ ہاتھ بھی جھاڑ دیا کرتا تھا۔ (۱۶)

پہلوٹھا بچہ ہونے کی وجہ سے والدین کا لاڈلا سلیم اختر، اپنے من کی مستی میں مگن، سب سے بے نیاز، اپنی ذات کے محور میں سرگرداں بڑا ہوتا گیا۔ بچپن کی یہ نرگسیت اور خود پسندی ان کی شخصیت کا جزو لاینفک بن گئی۔ نارسس (الفت ذات کا یونانی اسطورہ) کی خود پسندی، الفت ذات اور نرگسیت کے پہلو میں ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ مضمون ''آئینہ خانہ'' میں لکھتے ہیں:

نارسس بے حد حسین تھا، اتنا حسین کہ اس کے حسن کی مثال دی جاسکے، قسم کھائی جاسکے، مجسمہ بنا کے اسے پوجا جاسکے۔ بستی کی تمام ناریاں اور کنواریاں اس کی دیوانی تھیں کہ وہی سب کے من مندر کا دیوتا تھا، مگر نارسس ان سب باتوں سے لاتعلق اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا، اس لیے نہیں کہ اسے غرور حسن تھا بلکہ اس لیے کہ وہ خود بھی اپنے حسن جہاں سوز کی حشر سامانیوں سے آگاہ نہ تھا، لہذا یہ حسن بے پروا، دلوں پر قیامتیں ڈھاتا رہتا۔ (۱۷)

ڈاکٹر سلیم اختر خود بھی ایسے ہی رہے ہیں۔ اپنی ذات میں مگن، دوسروں سے بے نیاز، خود محسوس کر کے حظ اٹھانا اور دوسروں سے بظاہر لاتعلق رہنا اس کی فطرت کا خاصا ہے۔ حسن کے شیدائی ہونے کے باوجود، حسین لڑکیوں کے معاملے میں کبھی پہل نہیں کی، خود کو دل پھینک ثابت نہ کیا بلکہ 'الفتِ ذات' کے مرکز سے آگے پیچھے نہ ہٹے۔ کالج کے زمانے میں

بہت سی لڑکیاں ان کے دامِ محبت میں گرفتار ہوئیں ، ان پر مرمٹنے کی قسمیں کھائیں لیکن سلیم اختر یونان کے اسطورہ ''نارسس'' کی طرح ذات کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے رہے ۔کسی لڑکی کو چنداں اہمیت نہ دی ۔ ہاں ان کے دل میں یہ خواہش ضرور رہی کہ ''ایکو'' (نارسس کے دامِ محبت میں گرفتار) کی طرح اس کے اردگرد بھی حسین لڑکیاں منڈلاتی رہیں۔

جنس مخالف کی طرف سے محبت کے کنائے انہیں بھاتے تھے کیوں کہ اس سے ان کی نرگسیت کو تشفی ملتی تھی ۔کالج کے ایک ایسے ہی محبت کے بیان میں چھپی نرگسیت دیکھئے :

> شادی ! جبکہ میں نہ تو شادی کا قائل ، نہ ہی اس کے لیے تیار، ان پر مستزاد میری تنوع پسندی ! ۔۔۔۔اب میں نے اس کے ساتھ بات بے بات الجھنا شروع کر دیا ، اچھی خاصی گفتگو ہو رہی ہوتی مگر میں ایسا ''نکتہ'' پیدا کر دیتا کہ وہ گرمی کھا جاتی ، دونوں الجھتے ، بولتے ، بلکہ خوب بولتے ۔۔۔تمہارے گھر والے بہت امیر ہیں جبکہ میں معمولی تنخواہ پانے والا لائبریری میں ملازم ، بات نہیں بنے گی''۔ یہ سن کر عجیب ڈرامائی (یا پھر جذباتی) حرکت کی، اپنا پرس زمین پر دے مارا اور بولی ''مجھے روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہیں، میں دولت کو کیا سمجھتی ہوں۔۔۔ نور جہاں کے ایک کبوتر اڑا دینے پر سلیم مرمٹا تھا، سلیم تو میں بھی تھا مگر ذرا وکھری ٹائپ دا، بجائے اس کے کہ میں اس ادا پر مرمٹتا، جھک کر پرس اٹھاتا ، دامن دل سے مٹی پونچھتا، اسے چڑانے کو کہا ۔''اگر تم نے اس توقع پر یہ پرس پھینکا ہے کہ میں اسے اٹھا کر تمہیں پکڑاؤں گا تو بے فکر رہو۔ میں ایسا نہ کروں گا۔ وہ تنک کر بولی ۔مجھے تم سے اس کی توقع ہی نہیں۔خود پرست انسان،، ۔۔۔پرس کسی نے نہ اٹھایا ۔اس نے ملنا بند کیا، میں خوش ہوا ۔تم روٹھے ، ہم چھوٹے!'' (۱۸)

کالج میں تدریس کے دوران مختلف طالبات کے جھرمٹ میں ڈاکٹر سلیم اختر ،نرگس کے پھول کی مانند نظر آتے ہیں جہاں وہ طالبات کی تمام شوخ چشموں ، ترغیبات ،مخصوص مقاصد (نمبر زیادہ لگوانے کے لیے) نازوادا کے باوجود ڈاکٹر سلیم اختر بے حد غیر جذباتی ،محتاط ، بقائم ہوش وحواس ملتے۔حتٰی کہ بعض اوقات ترغیبات اس قدر بڑھ جاتیں کہ جان بوجھ کر پھسل جانے کو بھی جی چاہتا مگر ہر مرتبہ آتشِ شوق سے بچا رہا۔ آتشِ عشق جل نہ پائی۔ اس کے پس پشت ان کی شخصیت کا وقار، خود ضبطی اور نرگسیت بھی ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے بت کو سب سے اونچے استھان پر سجایا تا کہ ہر کس وناکس کی رسائی نہ ہو سکے۔

آپ بیتی یا خودنوشت کا نفسیاتی محرک بھی 'نرگسیت' ، یا ''الفت ذات'' ہی ہے ۔ جب فرد اپنی ذات کے گرد گھومنے والے واقعات کے پس منظر میں خود کو نمایاں تر ہو کر پیش کرتا ہے ۔ دوسروں کے مقابلے میں خود کو اہم متصور کرنا، نسب اور خاندان کے تفاخر کا ذکر کرنا، اپنے خصائص کا مبالغہ کی حد تک بیان، مختلف طرز کے مہمات کا ذکر کر کے خود کو دوسروں سے نمایاں حیثیت میں پیش کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ وہ خامیوں، نقائص ، ناراستیوں اور کجیوں کو پس پشت ڈال کر خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے تا کہ صاف ستھری اور بے داغ تصویر سب کے سامنے پیش کر سکے ۔ مصوری میں ''سیلف پوٹریٹ'' شاعری میں ''تعلّی' اور ادب میں ''خودنوشت'' کا نفسیاتی محرک نرگسیت ہی ہے ڈاکٹر سلیم

اختر ''تخلیقی شخصیت اور نرگسیت'' میں لکھتے ہیں :

ادب میں خود نوشت سوانح عمری بھی وہی کام کرتی ہے جو مصوری میں ''سیلف پوٹریٹ'' دونوں میں اظہار کا انداز جداگانہ سہی لیکن نفسی محرک ایک ہی ہے۔ نرگسیت ! یہ الفت ذات ہی تو ہے، جو لکھنے والے سے قطرہ سے گہر ہونے تک کے تمام مراحل کی عکاسی کراتی ہے اور اسی لیے خود نوشت سوانح عمریوں کی بیش ترصورتوں یعنی اعترافات ڈائری اور میمائرز وغیرہ سبھی کا نفسیاتی محرک نرگسیت ہی ہے۔ (۱۹)

نشان جگرسوختہ بھی نرگسیت کے اظہار کا ادبی روپ ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ذات کے مرکز کو نمایاں کر کے واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ انہوں نے ''مَیں'' کی عینک سے دنیا کو دیکھا ہے۔ 'میں' وہ کرداری صفت ہے جو مرکزِ ذات کے نظریے سے پھوٹتی ہے۔ وہ دنیا میں مدغم نہیں ہوتے بلکہ دور کھڑے ناظر بن کر دنیا کا جائزہ لیتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر شاہین مفتی:

اس میں شک نہیں کہ نشان جگرسوختہ ' 'الفت ذات' کے اثرات لیے ہوئے ہے، مصنف نے اپنے بارے میں دل کھول کر اشارے بھی دیئے ہیں اور پھر خود جوازیت کے حق کو استعمال کرتے ہوئے بہت سے مقامات پر اپنے آپ کو کئی مقدمات سے بری بھی کر دیا ہے۔ مصنف نے زیادہ تر اپنا سوفٹ امیج ابھارنے کی جو ابتدائی کوشش کی ہے ۔ اس کی رومان پروری، بہت دور تک اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ چنانچہ یہ سوفٹ امیج مصنف کی ذاتی مہربانی سے ہی آہستہ آہستہ کئی دوسرے رنگ بھی چھوڑنے لگا ہے۔ (۲۰)

ان کے مردم گریز اور تنہائی پسند رویے بھی ، ان کی 'الفت ذات' کے مظہر ہیں۔ وہ خود کسی کی جانب پیش قدمی نہیں کرتے ، اگر کوئی خود بڑھ کر انہیں سلام کر بیٹھے تو سپاٹ، باتاثر چہرے کے ساتھ '' وعلیکم'' بڑی مشکل سے ہونٹوں کے درواکر کے نکلتا ہے۔ عام حالات میں ان کی مردم بیزاری کا یہ عالم ہے تو ناراضی کے لمحات میں احباب کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ مردم بیزاری، کم آمیزی اور معاشرتی تعامل میں بے اعتنائی اور لاتعلقی کے رویوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

میرے بے جوش مصافحہ کی متعدد احباب نے شکایت کی ہے۔ دراصل Body Language اسے میرے بے سماجی (Asocial) رویہ پر مبنی لاتعلقی کا ایک انداز بتاتی ہے ، اسی طرح کئی دوستوں نے 'السلام علیکم ' کے جواب میں صرف 'وعلیکم' پر اعتراض کیا ہے ۔ میں نے Apathy کے جواب میں صرف اپنے لیے حصارِ درودیوار تعمیر کر رکھا ہے۔۔۔۔ اگر یہ کہوں کہ میں بے وزنی کے عالم میں زیست کر رہا ہوں تو اسے مبالغہ نہ جانئے۔ بے وزنی ، باطنی ہے، خارجی نہیں کہ خارج میں تو شانت نظر آتا ہوں۔ (۲۱)

یہ Apathy رویے سماجی 'الفت ذات' کے بت کے چکنا چور ہونے کے نتیجے میں پیداشدہ اعصابیت کا نتیجہ ہیں۔ جب حقیقی دنیا میں ان کی شخصیت کی نرگسیت کی تسکین نہ ہو پائی تو ردعمل کی صورت میں سماجی بے تعلقی اور بے اعتنائی کے رویوں نے جنم لیا۔

اعصابیت اور نیوراتیت ان کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہیں جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے تو ان کی

شخصیت میں متضاد رویوں اور رجحانات نے گھر کرنا شروع کردیا۔ دماغ میں کوئی چھپکلی گھس جاتی ۔شعور کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد اپنی اعصابیت کی تشخیص کی۔ ان کی شخصیت میں خاموشی، گم سم رہنا، جھجک اور ٹھٹھک جیسے عوامل ملتے ہیں۔ ان کی شخصیت دولخت ہوگئی۔ بظاہر نارمل ، شانت اور پرسکون رہنے والے سلیم اختر کے اندر آتش فشاں پلنے اور پکنے لگا۔ لکھتے ہیں:

> اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں چلتی ہوا سے لڑنے والا آتش بداماں اور کف آلود رہنے والا لڑکا تھا تو ایسا نہیں۔ میں تو بہت ہی بیبا تھا۔ میرا بھلا مانس ہونا میری اعصابیت کی وجہ سے ہے جس کا تب مجھے ادراک نہیں تھا مگر بعد میں جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو اپنی اعصابیت کی تشخیص کی، اس کے ہاتھوں میں بالعموم خاموش، ٹھٹھکا اور جھجکا سا رہتا تھا۔ نئے ماحول میں نئے لوگوں سے ملنا بلند پہاڑ پر چڑھنے جیسا مشکل کام لگتا۔ (۲۲)

آٹھویں جماعت میں ڈاکٹر سلیم اختر کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ اس عمر میں یوں بھی عنفوان شباب کی منزلوں کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ پھر بچپن کا احساس تفاخر، خود پسندی ، جنسی مشاہدات اور واقعات کے ہیولے خوف پر مبنی واقعات کے ملے جلے رجحانات ان کے لاشعور میں رخنہ اندازی کر چکے تھے ۔ جو فیٹسی کی صورت اختیار کر گئے ۔ اس بناء پر لڑکپن اور نوجوانی میں حقیقی زندگی سے نبھاہ مشکل ہوگیا۔ شعور اور لاشعور کے اس ٹکراؤ کا لازمی نتیجہ عصبانیت اور اعصابیت کی صورت میں سامنے آیا ۔ گھر کا پہلوٹھا اور لاڈلا بچہ معاشرتی عدم مطابقت کی بناء پر خود اعتمادی کھونے لگا۔ نتیجتاً تنہائی اور مردم گریزی کے رجحانات سامنے آنے لگے جو تاحال قائم ہیں۔ تنہائی اور اداسی کے دورے اسی اعصابیت کی خارجی مظاہر ہیں:

> بلاوجہ ہی تنہائی کا شدید احساس ہوتا اور اداسی کا دورہ پڑتا۔ کالج میں ہوتا تو کالج کی چھت کے آگے لگے چھجے پر تنہا بیٹھتا پرندہ کی آنکھ سے نیچے کا منظر دیکھتا رہتا ۔۔۔۔ یہ سب اعصابیت کی علامات تھیں۔ بعض اوقات معمولی سی بات سے نروس ہوجاتا ۔ سہم جاتا، خوفزدہ ہوجاتا۔۔۔۔ اسی اعصابیت کے تکلیف دہ مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ عید کا دن سخت بدمزگی میں گزرتا ہے۔ چاند رات سے ہی عجیب سا اعصابی تناؤ شروع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ عید والے دن جبکہ سب لوگ گلے مل رہے ہوتے، میں بلاوجہ گھر والوں سے لڑکر، گھر سے باہر نکل جاتا۔ (۲۳)

بظاہر کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ یا یادذہن میں نہیں جو تحت الشعور میں پوشیدہ ہو اور عید کے دن کے ساتھ منفی کنڈیشننگ کی وجہ سے بنی ہو لیکن یہ اعصابی تناؤ ہوش سنبھالنے سے اب تک بدستور قائم ہے ۔ بعض اوقات یہ اعصابیت اس حد تک حاوی ہوجاتی ہے کہ معاشرتی زندگی کے ضوابط تج کر جنگلوں کی طرف بھاگ جانے کو جی کرتا ہے یا اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لیے بچوں کی مانند زور زور سے رونے کو جی کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی زندگی میں وہ عرصہ جب وہ بسلسلہ ملازمت (کلرکی) دو سال پشاور میں مقیم رہے، انتہائی ناگواری ، ڈپریشن اور اعصابی تناؤ کا شکار رہے۔ حتٰی کہ ایک دو مرتبہ

خودکشی کا بھی فیصلہ کیا لیکن نادیدہ قوت نے روک دیا۔ انہوں نے شعوری طور پر زندگی کے واقعات میں سے ''پشاور'' میں رہائش اور وہاں کے اعصابی تناؤ بھری زندگی کو اپنی یادداشتوں میں شامل نہ کیا تو اس کی وجہ بھی وہاں کی تلخ زندگی تھی جس کی یاد جان بوجھ کر بھلانے کی نفسیاتی کوشش کی جاتی ہے۔ پشاور میں قیام کے دوران دوستوں نے شراب بھی پلائی لیکن انہیں بچپن میں شراب سے جو Negative Conditioning ہوئی تھی جب ان کے والد کے شاعر دوست عدمؔ کی پونا میں قیام، شراب نوشی، سلیم اختر کے والد کے ساتھ گھر میں آمدورفت نتیجتاً ان کی والدہ کی طرف سے مزاحمت، لڑائی جھگڑا اور پورے گھر میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی ۔ پشاور میں شراب کے لیے داخلی مزاحمت کا حامل بنا۔ ہر طرح کے برانڈز ان کے دوستوں نے آزمائے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر پر اثر نہ ہوا۔ (۲۴)

بچپن کے تلخ وشیریں واقعات ڈاکٹر سلیم اختر کے مقناطیسی لاشعور میں ذخیرہ ہوتے گئے، جنہوں نے قوی رجحان کی صورت میں نمو پاکر ان کی شخصیت کے تاروپود بنائے۔ ان کے زیراثر چلتا پھرتا، ہنستا روتا، ظاہرو باطن سے دست وگریبان، سلیم اختر زندگی نبھاتا چلا جارہا ہے ۔ ان کی پرپیچ شخصیت کے اکثر تاروپود ان کی نفسیات شناسی سے کھل گئے ہیں۔ نشان جگر سوختہ دراصل ان کی تحلیل نفسی ہے جس میں انہوں نے خود کو مکمل طور پر ایکسپوز تو نہیں کیا لیکن باطن کی طرف کچھ اشارے ضرور کردیئے ہیں جن کی گرہ کشائی سے باطن میں زیست کرنے والا سلیم اختر باہر نکل آتا ہے ۔ اتنا کچھ ظاہر ہونے کے باوجود ان کے نقاب (Persona) کی مضبوطی دیکھئے، کس قدر معصومیت سے پوچھتے ہیں:

> میں بنیادی طور پر بیباانسان ہوں، مگر پھر بھی متنازعہ؟ تو کیوں؟ انبارمل سیکس کے افسانے؟ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ؟ سالانہ ادبی جائزے؟ نفسیاتی تنقید؟ انفرادی طور پر یہ سب ، اجتماعی طور پر دشنامی دبستان کا سربراہ! (۲۵)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگرِ سوختہ (آپ بیتی) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۱۹۔۲۰۔

۲۔ نشان جگرِ سوختہ (آپ بیتی)، ص ۱۴، ۱۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۶۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی راقمہ سے گفتگو ۲۷ مئی ۲۰۱۶ء (پانچ بجے شام)۔

۸۔ محمد سعید، ڈاکٹر سلیم اختر، اپنی نظر میں (مرتبہ) مشمولہ سپوتنگ، لاہور، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ۴۱، ۴۲۔

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۶۹۔

۱۰۔ سہیل احمد، ژونگ کے نفسیاتی نظریات، لاہور: ادارہ تالیف وترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، باراول، دسمبر ۱۹۸ء، ص ۲۳، ۲۴۔

۱۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی راقمہ سے گفتگو ۲۷ مئی ۲۰۱۶ء (پانچ بجے شام)۔

۱۲۔ نشان جگرسوختہ ،ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

۱۳۔ ایضاً ،ص ۱۳۰، ۱۳۱۔

۱۴۔ بحوالہ نشان جگرسوختہ ،ص ۲۶، ۲۷۔

۱۵۔ ایضاً ،ص ۲۳۔

۱۶۔ ایضاً ،ص ۲۵۔

۱۷۔ سلیم اختر ، ڈاکٹر ، خودشناسی ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۰۱ء ،ص ۴۳۔

۱۸۔ نشان جگرسوختہ ،ص ۱۵۱، ۱۵۲۔

۱۹۔ سلیم اختر ، ڈاکٹر ، تخلیق اور لاشعوری محرکات ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۰۹ء ،ص ۶۷۔

۲۰۔ شاہین اختر ، ڈاکٹر ، ڈاکٹر سلیم اختر : شخصیت اور فن بسلسلہ پاکستانی ادب کے معمار ، اسلام آباد : پاکستانی ادب کے معمار H-8/1، ۲۰۱۵ء ،ص ۳۰۲۔

۲۱۔ شان جگرسوختہ ،ص ۲۹۱، ۲۹۲۔

۲۲۔ ایضاً ،ص ۶۴، ۶۵۔

۲۳۔ ایضاً ،ص ۹۸، ۹۹۔

۲۴۔ ایضاً ،ص ۱۱۵۔

۲۵۔ ایضاً ،ص ۲۲۳۔